



علمی و تحقیقی مجلہ ”محاکمہ“ یونیورسٹی آف سیالکوٹ

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

ڈاکٹر طالب حسین ہاشمی، پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلو شپ اسکالر، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، پاکستان

سعدیہ افتخار، پی ایچ۔ ڈی اردو اسکالر، الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

ہما حنیف، ایم۔ فل اردو اسکالر، مائی یونیورسٹی، اسلام آباد

کثیر تہذیبی شعور کی تشکیل: ”کئی چاند تھے سر آسماں“ کا تجزیاتی جائزہ

Formation of a Multicultural Consciousness: An Analytical Study of

“Kai Chand Thay Sar-e-Aasman”

Dr. Talib Hussain Hashmi, Post Doctorate Fellowship Scholar, IRI, IIUI, Pakistan.

drtalibhashmi@gmail.com

Sadia Iftikhar, Ph.D. Urdu Schoar, Al-Hamad Islamic University Islamabad.

9999@gmail.com

Huma Hanif, M.Phil Urdu Scholar, MY University Islamabad. Pakistan

Abstract

Shamsur Rahman Faruqi's novel “*Kai Chand Thay Sar-e-Aasman*” serves as a monumental exploration of cultural transformation and civilizational fusion in the Indian subcontinent. The study of Comparative traditions is essential in understanding how languages and cultures evolve through continuous interaction. Every language carries within it the essence of a distinct tradition, a collective memory of social, aesthetic and spiritual values. The Dravidian tradition of ancient Sindh one of the earliest known civilizations gradually expanded and transformed through contact with the Indo-Aryan, Indo-Islamic and later the Ganga-Jamuni traditions, finally intersecting with the Indo-European cultural framework during the colonial period. The British rule brought not only political dominance but also a linguistic and psychological hegemony. English was projected as the language of progress and intellect, while native languages and customs were systematically portrayed as primitive or obsolete. This subtle ideological manipulation led to the internalization of inferiority among local populations. Consequently, the indigenous tradition already a rich amalgamation of diverse cultural influences absorbed yet



another layer of colonial modernity, creating a hybrid identity that was both local and global. In “*Kai Chand Thay Sar-e-Aasman*”, Faruqi symbolically reconstructs this transitional period through the lens of literature, language and individual consciousness. The novel becomes a metaphorical arena where multiple civilizations coexist, confront, and ultimately merge into a complex yet harmonious mosaic. This research paper analyzes the novel as a reflection of the subcontinent’s historical, social and political realities, emphasizing how Faruqi transforms the narrative of cultural conflict into one of synthesis, dialogue and continuity thereby redefining the essence of South Asian identity.

Keywords: Cultural Synthesis, Colonial Modernity, Linguistic Hegemony, Indo-Islamic Tradition, Ganga-Jamuni Heritage, Hybrid Identity, Civilizational Encounter, Shamsur Rahman Faruqi.

ملخص

شمس الرحمن فاروقی کا ناول ”کئی چاند تھے سر آسمان“ برصغیر میں ثقافتی اور تہذیبی امتزاج کی گہری عکاسی پیش کرتا ہے۔ یہ تقابلی مطالعہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ زبانیں اور ثقافتیں باہمی تعامل کے ذریعے کس طرح ارتقا پذیر ہوتی ہیں، کیونکہ ہر زبان میں مخصوص تہذیبی روایت، اجتماعی یادداشت اور سماجی و روحانی اقدار پوشیدہ ہوتی ہیں۔ قدیم سندھ کی دراوڑی روایت ہند آریائی، ہند اسلامی اور گنگا جمنی تہذیبوں کے اثر سے ارتقا پذیر ہوئی اور نوآبادیاتی دور میں برطانوی استعمار کے لسانی اور نفسیاتی اثرات نے مقامی زبانوں اور روایات کو پسماندہ ظاہر کیا، جس سے مقامی اور عالمی اثرات کا ایک مرکب ثقافتی شعور وجود میں آیا۔ شمس الرحمن فاروقی اس ناول میں عبوری عہد کی تہذیبی کشمکش کو ادب، زبان اور فرد کے شعور کے تناظر میں پیش کرتے ہیں، جہاں مختلف ثقافتیں باہم موجود رہتی اور آمنے سامنے آتی ہیں۔ ناول ایک استعاراتی میدان میں بدل جاتا ہے جو پیچیدہ مگر ہم آہنگ تہذیبی نقش کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ تخلیق جنوبی ایشیا کی شناخت اور اس کی تاریخی و سماجی پیچیدگیوں کو از سر نو سمجھنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

کلیدی الفاظ: ثقافتی امتزاج، نوآبادیاتی جدیدیت، لسانی بالادستی، ہند اسلامی روایت، گنگا جمنی ورثہ، تہذیبی تصادم

ادب کسی معاشرے کے تہذیبی شعور کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ خصوصاً وہ ادب جو تاریخ کے کسی ایسے دور کی نمائندگی کرے جہاں ایک تہذیب کے چراغ مدھم ہو رہے ہوں اور ایک نئی تہذیب اپنی بالادستی قائم کرنے



کے مراحل طے کر رہی ہو، وہ نہ صرف تخلیقی اہمیت رکھتا ہے بل کہ ایک تہذیبی دستاویز بھی بن جاتا ہے۔ اُردو ناول ”کئی چاند تھے سر آسمان“ اسی تناظر کا ایک جمالیاتی اور فکری اظہار ہے جو ہندو اسلامی تہذیب کے زوال اور نوآبادیاتی نظام کی بالادستی کے نازک موڑ کو نہایت نفاست اور تحقیق سے پیش کرتا ہے۔ یہ ناول ایک ایسے دور کی علامت ہے جہاں برطانوی اقتدار کے اثرات نے ہندوستانی معاشرت، اقدار اور روایات کو گہرے طور پر متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ دہلی کی وہ تہذیبی فضا جس میں زبان کی لطافت، شعر و موسیقی کا حُسن اور معاشرتی شائستگی کی روایتیں زندہ تھیں۔ بتدریج نئے سماجی و سیاسی نظام کے زیر اثر ایک بحران کا شکار ہونے لگی۔ اسی تہذیبی انحطاط نے مقامی شعور کو اپنی بقا کے لیے نئے معنوی ڈھانچے تلاش کرنے پر مجبور کیا۔

”کئی چاند تھے سر آسمان“ میں یہ تہذیبی تصادم صرف ایک پس منظر نہیں بل کہ پورے بیانیے کا مرکزی موضوع بن جاتا ہے۔ ناول کا محوری کردار وزیر خانم دراصل اس تہذیب کی علامت ہے جو بین الثقافتی کشمکش میں اپنی شناخت برقرار رکھنے کی سعی کرتی نظر آتی ہے۔ مصنف نے نہ صرف تاریخی حقائق و واقعات کا احاطہ کیا ہے بل کہ اس دور کے ذہنی، فکری اور جمالیاتی رویوں کی تشکیل نو کو بھی پیش کیا ہے۔ یوں ناول قاری کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں تہذیبیں محض ٹکراتی نہیں بل کہ ایک دوسرے میں جذب ہو کر ایک نئے تہذیبی شعور کو جنم دیتی ہیں۔

یہ مقالہ اسی تعامل، مزاحمت اور تشکیل نو کے عمل کا تجزیاتی جائزہ پیش کرتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ ”کئی چاند تھے سر آسمان“ کس طرح ایک کثیر تہذیبی شعور کی نمائندگی کرتا ہے اور کس طرح یہ ادبی تخلیق، نوآبادیاتی عہد کی سیاسی، ثقافتی اور فکری تبدیلیوں کو اپنے بیانیے کے ذریعے ایک نئی معنویت عطا کرتی ہے۔ یوں یہ ناول صرف زوال کی المناک داستان نہیں، بل کہ تہذیب کے تسلسل، تغیر اور تشکیل کی ایک عمیق علامت بھی ہے۔

شمس الرحمن فاروقی کا ناول ”کئی چاند تھے سر آسمان“ محض تاریخ کے اوراق کی بازیافت نہیں، بل کہ تہذیبوں کے تصادم، اُن کے باہمی رقص و تقابل اور دھیرے دھیرے ہونے والے انضمام کی ایک نفیس تصویری تشکیل ہے۔ ناول میں زوال پذیر مغلیہ تمدن کی شکستہ فضا، انگریزی اثرات کا بڑھتا ہوا گھیراؤ اور برصغیر کی روایتی مسلم تہذیب کی لطافت اس



مہارت سے یکجا ہوئے ہیں کہ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے روشنی اور تاریکی کسی ان دیکھے کنارے پر ایک دوسرے میں تحلیل ہو رہی ہوں۔ شمس الرحمٰن فاروقی اس تاریخی تبدیلی کو صرف ایک گزری ہوئی داستان کے طور پر بیان نہیں کرتے، بل کہ اسے تہذیبوں کے درمیان جاری ایک زندہ اور بامعنی مکالمہ بنا کر پیش کرتے ہیں، جس میں ماضی حال سے ہم کلام نظر آتا ہے۔ ایسا مکالمہ جس میں مشرق کا وقار اور مغرب کی تازہ روایات ایک ہی افق پر نمودار ہوتی ہیں۔ تہذیب کے آداب، زبان، لباس، جمالیاتی احساس اور انسانی رویے کس طرح نئے رنگ میں ڈھلتے ہیں، ناول میں یہ سب کسی گہری داخلی موسیقی کی صورت ابھرتا ہے۔

”کئی چاند“ دراصل مختلف تہذیبوں کے استعارات ہیں۔ ہر چاند ایک ثقافتی سانس، ایک ذوق، ایک جمالیاتی روایت کا نمائندہ اور ان تمام چاندوں کا اجتماع ”سر آسمان“ نوع انسانی کی اس مشترکہ روح کی علامت ہے جو اختلاف کے باوجود ہم آہنگی کی تلاش ترک نہیں کرتی۔ یوں ناول نہ صرف تاریخ کا بیان بن کر سامنے آتا ہے، بل کہ یہ باور بھی کراتا ہے کہ تہذیبیں فنا نہیں ہوتیں، وہ نئی شکل میں زندہ رہنے لگتی ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ناول یہ حقیقت اجاگر کرتا ہے کہ انضمام ہمیشہ تصادم سے زیادہ دیرپا اور تخلیقی قوت رکھتا ہے۔ تہذیب، انسانی شعور کے اس طویل ارتقائی سفر کا جامع عنوان ہے جس میں انسان کا طرز حیات، اس کا جمالیاتی ذوق، اس کی فکری جہات اور اس کا اجتماعی شعور سب کسی ایک وحدت میں مندرج نظر آتے ہیں۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس اصطلاح کی تعبیرات اتنی گھنی اور مختلف ہو گئیں کہ اس کے اصل، فطری اور بنیادی معنی دھندلا کر پیچھے چلے گئے۔ ہر دور نے اپنے نظریاتی سانچے میں اس مفہوم کو ڈھالا۔ کبھی مذہب، کبھی علم، کبھی فن اور کبھی سیاست کو مرکزیت دے کر تہذیب کی کل کائنات انہی ایک زاویے میں قید کرنے کی کوشش کی گئی۔ کہیں فلسفیانہ رجحانات نے اسے محدود کیا، کہیں ذاتی تجربات کے رنگ زیادہ غالب آگئے اور کہیں مقامی تعصبات نے اس کے معانی پر دھند کی دبیز پرتیں جمادیں۔ اس فکری انتشار کے تناظر میں واحد معقول راستہ یہی ہے کہ ہم ”تہذیب“ کے لغوی سرچشمے، اس کے بنیادی اور اولیں مفہوم کی طرف پلٹیں۔ جب تک یہ واپسی ممکن نہیں ہوتی، نہ تہذیب کی ماہیت پوری طرح روشن ہو سکتی ہے اور نہ اس کے تاریخی تنوع اور فکری تسلسل کو صحیح طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔



تہذیب عربی زبان کا وہ لفظ ہے جس کی بنیاد میں پاکیزگی، درستی اور سنوارنے کے مفہیم پوشیدہ ہیں۔ لغوی طور پر اس کا مطلب ہے کسی شے کو بہتر بنانا، سنوار کر قابل قبول حالت میں لانا اور اسے حسن و قرینہ عطا کرنا۔

”کسی درخت یا پودے کو اس مہارت سے تراشنا اور سنوارنا کہ وہ نئی شاخیں نکالے، زیادہ توانا ہو جائے اور اس کی بڑھوتری حسن و توازن کے ساتھ آگے بڑھے“^(۱)

یہ مفہوم دراصل اُس بنیادی جوہر تہذیب کی جانب اشارہ کرتا ہے جو باطن کی پاکیزگی، ظاہر کی اصلاح و آرائش اور جمالی کمال کی تدریجی تکمیل پر قائم ہے۔ تہذیب صرف ظاہری تمدنی آثار و علامات کا مجموعہ نہیں، بل کہ ایک مسلسل ارتقائی عمل ہے جو انسان اور معاشرہ دونوں کو کدورت سے صفائی، کمزوری سے قوت اور بے ترتیبی سے جمالی ہم آہنگی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔

”فرہنگِ آصفیہ“ کے مطابق تہذیب کے معنوی دائرے کو یوں مرتب کیا جاسکتا ہے:

۱: آرائستگی، پاکیزگی، صفائی، درستگی اور اصلاح یعنی وہ کیفیت جس میں کسی شے یا رویے کو سنوار کر بہتر درجے تک پہنچا دیا جائے۔

۲: شائستگی، خوش خلقی، لیاقت، اہلیت، انسانیت، تربیت اور شرافت۔ یعنی وہ باطنی اوصاف جو فرد کو مہذب، متوازن اور اجتماعی زندگی کا اہل بناتے ہیں۔

فرہنگِ آصفیہ کے مطابق تہذیب ان اوصاف و خصائل کا مجموعہ ہے جو انسان کے باطن اور ظاہر دونوں کو نکھار دیتے ہیں۔ اس میں آرائستگی، صفائی اور پاکیزگی کے ساتھ درست طرز عمل، کردار کی اصلاح، شائستگی، خوش اخلاقی، اہلیت، لیاقت، آدمیت، تربیت، انسانیت اور شرافت جیسے وہ تمام عناصر شامل ہیں جو ایک فرد کو مہذب، متوازن اور باوقار بناتے ہیں۔ یہ صفات مل کر تہذیب کو محض ظاہری آداب کا نام نہیں رہنے دیتیں بل کہ اسے انسانی شخصیت کی ہمہ گیر تکمیل کا عنوان بنا دیتی ہیں“^(۲)

فرہنگِ آصفیہ کے مطابق، ”تہذیب“ انسان میں وہ تمام اوصاف و کیفیات پیدا کرنے والا مجموعہ ہے جو شخصیت کی نکھار اور سماجی زندگی کی بہتر کارکردگی کے لیے ضروری ہیں، جن میں آرائستگی، صفائی، پاکیزگی، درست رویہ، اصلاح کردار، شائستگی، خوش اخلاقی، اہلیت، لیاقت، آدمیت، تربیت، انسانیت اور شرافت شامل ہیں۔ یہ تعریف تہذیب کو محض بیرونی



آداب یارسی تعلیم تک محدود نہیں رکھتی بل کہ اسے اخلاقی، فکری اور عملی معیاروں کا جامع نمونہ قرار دیتی ہے۔ ”نور اللغات“ کے مطابق:

”اسی طرح نور اللغات میں ”تہذیب“ کی وضاحت کرتے ہوئے اسے پاکیزگی، اصلاحِ نفس، آراستگی، شائستگی، خوش اخلاقی، تہذیبِ اخلاق، درست خُلق، انسان دوستی، مہذب طرزِ عمل، تربیت یافتگی، تعلیم یافتگی اور باادب و شائستہ رویے کا نام دیا گیا ہے“^(۳)

یہ بحث اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ کسی بھی معاشرے یا تہذیبی گروہ کی تہذیب اس کے رہائشی ماحول میں جڑ پکڑنے اور روزمرہ زندگی کے تجربات سے جنم لیتی ہے۔ یہ وہ ماحول ہے جہاں زندگی کے ہر شعبے کی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں اور یہی تہذیب اس گروہ کے لیے قیمتی ثقافتی ورثے کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ ہر زبان اپنے اندر ایک مخصوص تہذیب کی روح، اقدار اور فکری ورثے کو سمیٹے ہوتی ہے اور اسی تہذیب کی ترجمان بن کر سامنے آتی ہے۔

سندھ کی دراوڑی تہذیب کو پانچ ہزار سال قبل کی دنیا کی چار عظیم تہذیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ تہذیب وقت کے ساتھ مختلف ناموں اور صورتوں میں جلوہ گر ہوتی رہی۔ کبھی سندھ کی تہذیب کے طور پر، پھر ہند، بعد ازاں ہند اسلامی اور گنگا جمنی تہذیب کی صورت میں اور بالآخر نوآبادیاتی عہد میں اس نے ہند۔یورپی تہذیب کے اثرات قبول کر لیے۔ اس دور میں مقامی تہذیب کے زوال میں انگریز حکمرانوں کا نمایاں کردار تھا، جنہوں نے مقامی زبان، رسم و رواج اور ثقافت پر اپنا اثر مسلط کیا۔ مقامی لوگوں پر یہ باور کرانا کہ ان کی روایات، تاریخ، ادبی ورثہ اور ثقافتی شناخت ماضی کی چیزیں ہیں، ایک نفسیاتی حکمت عملی تھی، جسے ہر فاتح اپنے اقتدار کے تسلسل کے لیے اپناتا ہے۔ یوں ایک نئی زبان اور نئی تہذیب مقامی ثقافت میں ضم ہو گئی، جو پہلے ہی مختلف تہذیبوں اور زمانوں کا مرکب تھی۔

انیسویں صدی ہندوستان کی تاریخ میں خاص اہمیت کی حامل رہی، کیوں کہ اس دوران دو تہذیبیں متوازی طور پر وجود میں تھیں: ایک ہندوستانی یا مشرقی تہذیب اور دوسری مغربی تہذیب۔ شمس الرحمن فاروقی کے ناول ”کئی چاند تھے سر آسمان“ میں یہ دونوں تہذیبیں نہ صرف پلاٹ اور کرداروں کے ذریعے بل کہ زمان و مکاں، روزمرہ زندگی اور معاشرتی



جزئیات کے ذریعے بھی منظر عام پر آتی ہیں۔ کرداروں کی گفت گو میں، چاہے وہ امراء، ادبا، شعراء، ملازمین یا عام لوگ ہوں، حفظ مراتب اور تہذیبی آداب کی جھلک واضح ہے۔ تعلیم، قالین کے سات رنگ، موسیقی کے سات سر، مصوری، انگریزوں کے لب و لہجہ اور دیگر ثقافتی عناصر، ناول میں تہذیب کی عمیق عکاسی کرتے ہیں۔

فاروقی کا یہ ناول ایک ایسا تہذیبی آئینہ پیش کرتا ہے جس میں اسلامی ہند تہذیب اور ہندیورپی تہذیب ایک متوازن اور ہم آہنگ انداز میں ساتھ چل رہی ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کے اثرات نے غیر ملکی حکمرانوں کے ذریعے مقامی زبان و ثقافت پر اثر ڈالنے کی کوشش کی، لیکن باشعور افراد نے اپنی زبان، روایات اور اقدار کے تحفظ کی کوشش جاری رکھی۔ وزیر خانم کے پانچویں پشت کے فرد، ڈاکٹر وسیم جعفر کے کردار کے ذریعے مصنف نے نہ صرف قصہ گوئی کی بل کہ اپنے تہذیبی تشخص کی حقیقت کو اجاگر کیا، جہاں وسیم جعفر خود مصنف کی علامت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

انڈیا آفس لائبریری کے بیانات، نوآبادیاتی نظام کے منفی اثرات، مختلف ریاستوں کے شہریوں کی ثقافتی شناخت میں کمی، اور وسیم جعفر کی اپنی نسل و تاریخ کی تلاش، سب اس تہذیبی و سماجی تناظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی نے تہذیب کے ہر پہلو کو باریک بینی سے پیش کیا ہے: لباس، ملبوسات، مشرق و مغرب کے فرق، مختلف شہروں کی منفرد خصوصیات اور معاشرتی درجہ بندی کے مطابق لباس کے بدلاؤ کو واضح کر کے، ناول میں ہر تہذیبی زاویے کو مؤثر انداز میں جگہ دی ہے۔

”ولیم فریزر کا لباس مکمل طور پر ہندوستانی تہذیب کا عکاس تھا۔ اورنگ آباد کے ہمو کا ایک ننگ پاجامہ، بدن پر نفیس نقش و نگار سے مزین کرتا، اور اس کے اوپر سیاہ مخملی نیمہ یا انگر کھا جس کی آستینیں کٹی ہوئی تھیں۔ اس کے آٹھوں انگلیوں میں قیمتی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں، اور سر پر سرخ و سیاہ موتیوں کا بھرا ہوا چیرہ بلدار سجایا گیا تھا۔ ہر زاویے سے وہ بالکل دلی کے کسی امیر زادے کی طرح لگ رہا تھا،“^(۳)

شمس الرحمن فاروقی نے تہذیب کے سب سے معمولی جزو پر بھی بڑی باریکی اور حساسیت کے ساتھ نظر ڈالی اور اسے بیان کرنے میں مہارت دکھائی۔ پنڈت نند کشور کا دیوان حافظ سے فال نکالنا اور اس عمل کے عوض کسی بھی قسم کا معاوضہ قبول کرنے سے انکار کرنا، اس روایت کی روحانی وقار اور بے غرضی کا مظہر تھا اور پھر بھی وزیر خانم کی جانب سے ان پر جاری



رہنے والی عزت و احترام، ہندو اور مسلم کے درمیان ہم آہنگی کی ایک جاذب نظر تصویر پیش کرتا ہے۔ الفاظ کا انتہائی نازک اور محتاط انتخاب شہروں کی منفرد تہذیبی شناخت کو نمایاں کرتا ہے۔ نواب شمس الدین احمد خاں کے محل کی تفصیل اس کی بہترین مثال ہے: عمارتوں کی تعمیر و تزئین، نفیس نقش و نگار اور آرٹس و زیبائش کے مختلف پہلوؤں کو نہایت باریکی سے بیان کیا گیا ہے، ساتھ ہی ان جگہوں کا ذکر بھی ملتا ہے جو کسی خاص ہنر یا دستکاری سے منسوب ہیں۔ روشنی کا اہتمام، پنکھوں کی مختلف اقسام اور دیگر چھوٹے مگر اہم عناصر ایک مکمل اور جامع تہذیبی منظر نامہ ہمارے سامنے رکھتے ہیں۔ اسی طرح، ولیم فریزر کا مزار مشرقی اور مغربی فن تعمیر کے حسین امتزاج کی جیتی جاگتی مثال کے طور پر کھڑا ہے، جو دیکھنے والے کو دونوں تہذیبوں کی خوبصورتی اور ہم آہنگی کا احساس دلاتا ہے۔

تاریخی طور پر یہ ناول انیسویں صدی سے بھی قبل کے دور سے شروع ہو کر ۱۸۵۶ء میں اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ پورا بیان ہمیں ایک ایسی دنیا کی سیر کراتا ہے جو سماجی اور تہذیبی اعتبار سے نہ صرف بھرپور اور زندہ ہے بلکہ اپنی ساخت میں گہری استحکام اور معنوی بالیدگی بھی رکھتی ہے۔ ہر گوشہ زندگی کی چہل پہل اور متحرک توانائی سے لبریز ہے۔ یہ دنیا اپنی تہذیبی عظمت پر فخر کر سکتی ہے اور اس کی ادبی تہذیب بھی پوری تابناکی کے ساتھ جلوہ گر ہے، خود کو دنیا کی دوسری بڑی تہذیبوں سے کم تر نہیں سمجھتی۔ مگر وقت کی گردش کے ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے اور سماں کی شکل نئی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے ناول کے اختتام پر شامل کیے گئے ’اظہارِ تشکر‘ میں خود اس امر کی صراحت کی ہے کہ:

”فاروقی کی نظر میں اس تصنیف کو محض ایک تاریخی ناول کے خانے میں مقید کرنا اس کے فکری دائرے کو محدود کر دیتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے اٹھارویں اور انیسویں صدی کی ہندو اسلامی تہذیب، انسانی تجربے کی گہرائیوں، اور تہذیبی و ادبی رشتوں کے باہم پیوست نقش کے طور پر دیکھا جائے۔ ایک ایسا ہمہ گیر مرقع جو تاریخ سے آگے بڑھ کر زندگی اور ثقافت کی معنویت کو آشکارا کرتا ہے“^(۵)

اردو ادب میں اس نوع کے ناول خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ نصف صدی قبل شعور کی روانی کی تکنیک سے ”آگ کا دریا“ وجود میں آیا، مگر ہندو اسلامی تہذیب کے لطیف، باریک اور غیر محسوس نقوش کو روایتی بیانیہ اسلوب میں سمودینے کا ہنر ”کئی چاند تھے سر آسماں“ کو ایک بے مثال اور دیرپا ادبی دستاویز بنا دیتا ہے۔ بالخصوص جب ناول نگار انگریزی اقتدار کے



بتدریج پھیلاؤ کے پس منظر میں اینگلو-اسلامی تہذیبوں کے تصادم کو پیش کرتا ہے تو قاری خود کو ایک ڈھلتی ہوئی دنیا کے بیچ کھڑا پاتا ہے، جہاں ہر منظر زوال، تغیر، تہذیبی نزاکت اور انسانی زندگی کی تہہ دار پچھیدگیوں کا آئینہ بن جاتا ہے۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہمارے ملک میں ہند اسلامی دنیا کیسی تھی؟ اس دور کی تہذیب اور ادبی سماج کس طرح کے تھے؟ انگریزی سیاست اور اس کے اثرات کی وجہ سے معاشرت میں کون سی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں؟ مغلیہ سلطنت کی کمزور ہوتی ہوئی بادشاہت اور انگریزی حکومت کا ہندوستان پر بڑھتا ہوا شکنجہ۔ یہ سب کچھ اس ناول میں بخوبی سمایا گیا ہے۔ ”کئی چاند تھے سر آسماں“ نہ صرف ایک ادبی شاہکار ہے بل کہ اس کے ذریعے ہم اس تاریخی، تہذیبی اور سماجی منظر نامے کی مکمل جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ ذاکر حسین کے مطابق:

”انگریزی اقتدار کے عہد میں مختلف سماجی طبقوں اور متنوع مقاصد کے لیے زبان کے درست انتخاب میں امتیاز قائم رکھنا ایک نہایت کٹھن مرحلہ ہے۔ حاکم وقت کی زبان، لشکروں اور سیاحوں کی بولی، امر و سلاطین کی گفتار، اہل سخن کا لہجہ اور عوام الناس کی روزمرہ زبان۔ ہر ایک کے لیے جداگانہ اسلوب برتنا، اور ہر عہد و ہر باب کے مزاج کے مطابق زبان کو برتنے ہوئے ناول کی تکمیل کرنا، شمس الرحمن فاروقی کی فنی بصیرت اور ادبی مہارت کا روشن اور ناگزیر پہلو ہے“^(۶)

شمس الرحمن فاروقی نے اپنے ناول میں مشرقی اور مغربی معاشرتی قدروں کے چند اہم اور عمیق پہلو اس انداز سے پیش کیے ہیں کہ دونوں تہذیبوں کی روایتی تشکیل اور فکری دوریاں بخوبی عیاں ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر، مغربی معاشرے میں گفت گو کے دوران مخاطب سے آنکھ ملانا غیر معمولی نہیں سمجھا جاتا بل کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو بات کرنے والے کو دھوکہ باز تصور کیا جاتا ہے۔ تاہم مشرقی معاشرے میں یہ عمل بعض اوقات ناپسندیدہ اور قابل اعتراض سمجھا جاتا ہے۔ ناول کی مرکزی ہستی، وزیر خانم، ایک جامع اور مکمل تہذیبی شخصیت کی عکاس ہیں۔ ان میں وہ تمام ثقافتی، اخلاقی اور فکری صفات موجود ہیں جو ایک مستند تہذیبی فرد کی شناخت کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ وزیر خانم کی داستان کے ذریعے قاری کو انیسویں صدی کی زوال پذیر تہذیب کی عمیق تصویر نظر آتی ہے، جہاں لوگ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی گرفت سے آگاہ ہونے کے باوجود اپنی تلخ حقیقتوں سے منہ موڑ کر عیش و عشرت کے لمحوں میں غرق ہیں۔



”کئی چاند تھے سر آسماں“ کو تہذیبی ناول کے طور پر پڑھتے ہوئے کئی فکری سوالات ابھرتے ہیں، جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ سٹمس الرحمن فاروقی نے حکیم احسن اللہ خان جیسے متنازع اور تاریخی طور پر غدار شخصیت کو اپنے ناول میں مرکزی کردار کے طور پر کیوں پیش کیا۔ تاریخی شواہد کے مطابق، احسن اللہ خان ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران برطانوی استعمار کے جاسوس تھے؛ انہوں نے محل میں ہونے والی انقلابی سرگرمیوں کی خبر انگریز حکام تک پہنچائی، بہادر شاہ ظفر کو جنرل بخت خان کے مشورے پر عمل کرنے سے روکا، اور یوں جنگ کی تقدیر اپنی سازشوں کے ذریعے موڑ دی۔ اس کے بدلے انہیں برطانوی حکومت کی جانب سے ماہانہ پنشن دی گئی، مگر وہ زندگی بھر نسبتاً گمنامی میں رہے، جب کہ بہادر شاہ ظفر کی مہربانی اور انگریزوں کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے ان کی جان کئی بار محفوظ رہی۔

فاروقی نے احسن اللہ خان کو ناول میں اہم کردار کی حیثیت دی ہے تاکہ قاری یہ سمجھ سکے کہ تہذیب، کردار اور انسانی رویوں کی پیچیدگیاں محض روایتی اچھائی یا برائی کے دائرے میں نہیں آتیں، بل کہ انہیں تاریخی، سماجی اور ثقافتی حالات بھی شکل دیتے ہیں۔ اس طریقے سے ناول قاری کو تاریخ کے ساتھ اخلاقی اور تہذیبی مضامین کی باریکیوں کا شعور دلاتا ہے اور دکھاتا ہے کہ انسانی کردار کی اثر پذیری ایک متحرک اور کثیر الجہتی عمل ہے۔

فاروقی نے اپنے ناول میں مشرقی اور مغربی اقدار کے بعض ایسے نازک پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جن سے دونوں تہذیبوں کی روایتوں اور رویوں کا فرق بخوبی محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، مغرب میں مخاطب سے بات کے دوران آنکھیں ملا کر دیکھنا کوئی معیوب عمل نہیں سمجھا جاتا، بل کہ اس کے برعکس اگر ایسا نہ کیا جائے تو بات کرنے والے کو دھوکہ باز یا مکار سمجھا جاتا ہے، جبکہ مشرق میں یہ عمل بعض اوقات قابل اعتراض تصور کیا جاتا ہے۔

ناول کا مرکزی کردار، وزیر خانم، ایک بھرپور تہذیبی شخصیت کی حامل ہے، جس میں وہ تمام تہذیبی نقوش باسانی نظر آتے ہیں جو کسی بھی مکمل تہذیبی شخصیت کے لیے لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ وزیر خانم کی کہانی کے ذریعے قاری کو انیسویں صدی کی زوال آمادہ تہذیب کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا ہے، وہ تہذیب جو انگریزوں کی سیاسی پیش رفت کو دیکھ رہی ہے، مگر تلخ حقائق سے نظریں چراتے ہوئے اپنی زندگی کو عیش و عشرت میں گزارنے کو ترجیح دیتی ہے۔



”کئی چاند تھے سر آسماں“ کو تہذیبی ناول کے طور پر پڑھتے ہوئے کئی سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، حکیم احسن اللہ خان جیسے غدار کو فاروقی نے اپنے ناول میں ہیرو کے طور پر کیوں پیش کیا؟ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے سب سے متنازع اور قابلِ بحث کرداروں میں حکیم احسن اللہ خان شامل ہیں، جن کے روزنامے Memories of Hakim Ahsanullah Khan کا پہلا تفصیلی تجزیہ و محاکمہ ڈاکٹر معین الحق نے مرتب کیا۔ تاریخی شواہد کے مطابق، حکیم احسن اللہ خان برطانوی استعمار کے خاص جاسوس تھے، جنہوں نے دہلی کے محل میں ہونے والی انقلابی سرگرمیوں کی ہر لمحہ بہ لمحہ روداد انگریز حکام تک پہنچائی۔ انہوں نے بہادر شاہ ظفر کو جنرل بخت خان کے مشورے پر عمل کرنے سے روکا، اور یوں ممکنہ فوجی پیش رفت کو ناکام بنا دیا۔ اگر بہادر شاہ بخت خان کے حکم کے مطابق روہیل کھنڈ منتقل ہو جاتے تو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا منظر نامہ بالکل مختلف ہو سکتا تھا۔

حکیم احسن اللہ خان کے اقدامات نہ صرف فوجی اور سیاسی نتائج کے لیے اہم تھے بل کہ اس نے بہادر شاہ ظفر کو ہڈ سن کے سامنے سجدہ کرنے پر مجبور کرنے میں بھی کردار ادا کیا، جو اس کی خفیہ خدمات کا مظہر تھا۔ ان خدمات کے بدلے انہیں برطانوی حکومت کی جانب سے ماہانہ دو روپے کی پنشن دی گئی، حالانکہ وہ عمومی طور پر گمنامی میں زندگی گزارنے پر مجبور رہے۔ اس تناظر میں، حکیم احسن اللہ خان کی شخصیت محض غداری تک محدود نہیں بل کہ ۱۸۵۷ء کے تاریخی اور سماجی پیچیدگیوں میں انسانی کردار اور سازش کے باہم تعلقات کی ایک زندہ مثال پیش کرتی ہے۔

حکیم احسن اللہ خان نے اپنی ساری زندگی گمنامی میں اس لیے گزاری کیونکہ اس کی خدمات اگرچہ برطانوی حکام کے لیے قیمتی تھیں، لیکن ان کا انکشاف ہندوستانی عوام اور آزادی کے علمبرداروں کے نزدیک غداری کے مترادف تھا۔ عوامی نفرت اور تاریخی تنقید کی روشنی میں کھلے عام اپنی شناخت ظاہر کرنا نہ صرف ذاتی خطرہ بن سکتا تھا بل کہ ان کے لیے سماجی قبولیت بھی ناممکن تھی۔ اس لیے انہوں نے برطانوی سرپرستی میں محدود انعام (ماہانہ پنشن) تو حاصل کی، مگر عوامی منظر سے خود کو دور رکھتے ہوئے زندگی بھر چھپ کر رہنے کو ترجیح دی، تاکہ محفوظ رہیں اور اپنی ذاتی زندگی برقرار رکھ سکیں؟۔ احسن اللہ کی جاسوسی اور غداری کا علم لوگوں کو ہو چکا تھا اور ان کی جان لینے کی خواہش رکھنے والے بھی موجود تھے، لیکن بہادر شاہ



ظفر انہیں اپنا مخلص سمجھتے اور انگریزوں کے ساتھ ان کے روابط کو ایک معتبر ذریعہ جانتے تھے، اسی لیے ہر مرتبہ احسن اللہ کی جان بخشی بہادر شاہ کی وجہ سے ممکن ہوتی۔ یہ سوال واقعی دلچسپ ہے کہ حکیم احسن اللہ جیسے غدار کو شمس الرحمن فاروقی نے اپنے ناول ”کئی چاند تھے سر آسماں“ میں ہیرو کے طور پر کیوں پیش کیا؟ یہ فاروقی کے تہذیبی تناظر، کردار کی پیچیدگی، اور تاریخ کی تلخ حقیقتوں کو بیان کرنے کے منفرد انداز کو ظاہر کرتا ہے۔“ (۷)

ناول کا تہذیبی مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ہندو اسلامی تہذیب ایک نئے موڑ پر کھڑی ہے جہاں وہ رفتہ رفتہ ہند یورپی خصوصاً برطانوی تہذیبی دباؤ میں مدغم ہوتی جا رہی ہے۔ یہ انضمام محض سیاسی غلبے کا نتیجہ نہیں بل کہ ایک گہرا تہذیبی اور فکری عمل ہے، جو نوآبادیاتی نظام کی بالادستی کے ساتھ ساتھ ذہنی دنیا کی تشکیل نو سے بھی وابستہ ہے۔ برطانوی اقتدار نے نہ صرف ہندوستان کے وسائل، اداروں اور معاشی ڈھانچوں پر اثرات مرتب کیے بل کہ انسانی رویوں، سماجی اقدار اور تہذیبی بیانیے تک کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ یوں قدیم ہندو اسلامی روایت بتدریج ایک ایسے بیانیے میں ڈھالی جانے لگی جس کی تشکیل میں مغربی نظریات کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

ایڈورڈ سعید نے شرق شناسی (Orientalism) میں جس ”متنی غلبے“ کا ذکر کیا ہے، وہ مکمل طور پر اس صورت حال پر صادق آتا ہے۔ ان کے مطابق نوآبادیاتی طاقت صرف سیاسی اقتدار سے مطمئن نہیں ہوتی بل کہ وہ ذہنی وادبی حلقوں تک رسائی حاصل کر کے ایسے متن کی تشکیل کرتی ہے جو مشرق اور مغرب کے درمیان واضح تفاوت قائم کرے۔ مغرب اپنی برتری کو ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے جب کہ مشرق کو کمتر، غیر تہذیب یافتہ اور محض معلومات کا ذخیرہ سمجھ کر مطالعے کی چیز بنا دیتا ہے۔ اس طرح متن میں داخل ہونے والی یہ تقسیم نہ صرف علمی بیانیے کو متعصب بناتی ہے بل کہ اس تہذیب کو بھی مسح کر دیتی ہے جسے نوآبادیاتی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

بعض مغربی مصنفین تو ہندوستانی معاشرے کو یوں پیش کرتے ہیں جیسے وہ انگریزی تہذیب کی ایک بگڑی ہوئی اور پسماندہ شکل ہو۔ اس طرز فکر کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ مقامی تہذیب کے اپنے اندر سے ابھرنے والے بیانیے کمزور پڑ جاتے ہیں اور ان کی جگہ بیرونی نظریات اور تعبیرات لے لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نوآبادیاتی عمل صرف زمین کا



نہیں بل کہ ذہن کا قبضہ بھی ہے، اور یہی تبدیلی ناول کے متن اور کرداروں کی تہذیبی نفسیات سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یوں بیانیہ یہ دکھاتا ہے کہ کیسے ایک مضبوط تہذیب بھی استعمار کے فکری دباؤ کے سامنے رفتہ رفتہ اپنی شناخت کھونے لگتی ہے اور نئے معنوی دائرے میں ڈھل جاتی ہے۔ ایڈورڈ سعید (Edward Said) کا مشاہدہ یہ ہے کہ:

”اسلام پر تحقیق کرنے والے بعض مشرق شناسوں نے اسلام سے فاصلہ اختیار کرنا غیر ضروری سمجھا، حالانکہ اسی فاصلے کے ذریعے وہ اپنے یورپی تمدن کی تہہ تک جا کر اسے بہتر طور پر سمجھ سکتے تھے۔ اس کے برعکس، اسلام سے قربت نہ چھوڑنے نے یورپی تمدن کی برتری کے احساس کو مزید مستحکم کر دیا اور مشرق، جس میں اسلام بھی شامل تھا، کو ایک کمتر، نقصان دہ اور خطرناک تہذیبی نمائندے کے طور پر پیش کیا“^(۸)

”کئی چاند تھے سر آسمان“ محض کرداروں کا نہیں، تہذیبی ایسے کا ناول ہے اور تہذیب کے مختلف دائرے بناتا ہے۔ اس کا ہیر و کوئی آدمی نہیں، وقت ہے۔ اس میں زوال آمادہ سوسائٹی کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ فاروقی کا یہ ناول ہندوستان کی تہذیب کی سچی عکاسی کرتا ہے۔

”کئی چاند تھے سر آسمان“ اپنی فنی ساخت، موضوعاتی وسعت اور تہذیبی گہرائی کی وجہ سے اردو ناول کی تاریخ میں ایک نمایاں سنگ میل کے طور پر کھڑا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے اس میں محض داستان گوئی نہیں کی بل کہ ایک پوری تہذیب کی روح کو صفحات پر زندہ کر دیا ہے۔ یہ ناول ہمیں اس سماج میں لے جاتا ہے جو بظاہر شان و شوکت، رقص و سرود اور جمالیاتی تفکر کا مرکز تھا مگر اندرونی طور پر زوال اور انہدام کے عمل سے دوچار تھا۔ یہی نقطہ اس ناول کی ادبی اور تہذیبی معنویت کا مرکز ہے۔ فاروقی نے دکھایا کہ تہذیب محض عمارتوں، آرٹسٹری ظواہر اور رسومات کا نام نہیں، بل کہ اس کے پیچھے بستے ہوئے انسان، ان کے اقدار، جمالیاتی احساسات، محبتیں، روایات اور ذہنی رویے ہی اصل تہذیب ہوتے ہیں۔ جب انسان کی قدر کھو جائے تو تہذیب کا وجود برقرار رہ ہی نہیں سکتا۔



ناول میں وزیر خانم کی زندگی محض ایک فرد کی داستان نہیں، تہذیب کے لمبے کی تمثیل ہے۔ وہ ایک فن کار روح رکھتی ہے مگر اس کے گرد پھیلا ہوا معاشرہ اسے ایک کنیزِ حسن کے طور پر برتا ہے۔ اس کی ذات میں عورت کی تخلیقی قوت، محبت کی پاکیزگی اور سماجی شکست و ریخت، تین بڑے بیانیے یکجا ہو جاتے ہیں۔ اس کردار کی شکست صرف ایک عورت کی ہار نہیں بل کہ فن، حسن اور اقدار کی شکست ہے۔ وزیر خانم کی ہر کامیابی بھی اپنے اندر کسی نہ کسی نقصان کا پہلو لیے ہوئے ہے، جیسے تہذیبوں کے زوال میں کچھ نہ کچھ قائم رہ جانے کے باوجود اصل جو ہر چھن جاتا ہے۔

ناول کا اصل ہیرو وقت ہے، یعنی تاریخ کی وہ بے رحم قوت جو کسی عظمت کو دوام نہیں دیتی۔ شاہی دربار کا زوال، سیاسی انتشار، نوآبادیاتی قوتوں کی پیش قدمی اور سماجی نظام کی شکست سب اس بات کی علامت ہیں کہ تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے۔ فاروقی نے یہ تبدیلی صرف واقعات کے ذریعے نہیں دکھائی بل کہ زبان، محاورے، فنونِ عالیہ اور معاشرتی روایات کی شکست و ریخت کے ذریعے بھی واضح کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ قاری پر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا تہذیبی منظر نامہ دیکھ رہا ہے جہاں روشنی بتدریج مدھم ہو کر تاریکی میں ڈھل رہی ہے۔

فاروقی کا فن یہ کمال رکھتا ہے کہ وہ ماضی کی شان و شوکت کے بیان میں جذباتیت سے بے نیاز رہ کر محققانہ بصیرت کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ یہ ناول نہ صرف مسلمانوں کے تہذیبی زوال کی ہسٹری بیان کرتا ہے بل کہ یہ بھی بتاتا ہے کہ تہذیبیں اپنی داخلی کمزوریوں، ذہنی جمود اور اقدار کی پامالی کے باعث ٹوٹی ہیں۔ فن و لطافت کا مرکز ہوتی سلطنتِ اودھ جب باطن سے کھوکھلی ہوئی تو ظاہری شکوہ بھی اسے نہ بچا سکا۔ وزیر خانم کے زوال میں یہی پیغام پوشیدہ ہے۔

یوں کئی چاند تھے سر آسماں ماضی کی نوحہ گری نہیں بل کہ ایک تہذیبی شعور کی بیداری ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ تاریخ صرف طاقت و فاتحین کی نہیں بل کہ ان تہذیبوں کی بھی کتاب ہے جو بکھر کر مٹی میں مل گئیں۔ فاروقی نے اس بکھرتی ہوئی تہذیب کو نہایت محبت، درد اور کمالِ فن کے ساتھ محفوظ کر دیا ہے۔ یہ ناول ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ تہذیبیں زندہ رہتی ہیں تو انسانوں کے باطن سے، ان کی شناسائی، دانش اور خود شعوری سے۔ اگر یہ عناصر مفقود ہو جائیں تو بڑے سے



بڑا آسمان بھی کئی چاندوں کی روشنی کو سہارا نہیں دے سکتا۔ اسی لیے یہ ناول محض کرداروں کا نہیں بل کہ ایک تہذیب کے ایسے کانوحہ ہے۔ ایک دل گرفتہ اور لازوال شاہکار جو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ناول ”کئی چاند تھے سر آسمان“ اردو ناول کی روایت میں محض ایک تاریخی یا عشقیہ داستان نہیں بل کہ ایک ایسے عہد کی تہذیبی، سماجی اور فکری تشکیل کا آئینہ دار ہے جو برصغیر کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اس ناول کے ذریعے شمس الرحمن فاروقی نے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہندوستانی معاشرے کو نہ صرف تخلیقی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے بل کہ اس عہد کے کثیر تہذیبی شعور کو ایک ہمہ گیر فکری تناظر میں منقلب کیا ہے۔ یہی کثیر تہذیبی شعور اس ناول کی فکری اساس اور معنوی جہتوں کا مرکز و محور ہے، جو قاری کو ماضی کی تہذیبی پیچیدگیوں سے روشناس کراتا ہے۔

ناول کا اختتامیہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ تہذیب کسی ایک عنصر یا ایک رخی شناخت کا نام نہیں بل کہ مختلف تہذیبی، لسانی، مذہبی، سماجی اور جمالیاتی عناصر کے باہمی تعامل سے تشکیل پاتی ہے۔ ”کئی چاند تھے سر آسمان“ میں مسلمان، ہندو، فارسی، اردو، مقامی اور غیر مقامی اثرات اس طرح باہم پیوست دکھائی دیتے ہیں کہ ایک جامع تہذیبی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ اس فضا میں نہ صرف اثر افیہ بل کہ عام انسان، عورت، مرد، فنکار، عالم، شاعر اور سپاہی سب اپنے اپنے تہذیبی حوالوں کے ساتھ موجود ہیں۔ یہی تنوع اس ناول کو کثیر تہذیبی شعور کی علامت بناتا ہے۔

ناول کے مرکزی کردار وزیر خانم کی شخصیت اس کثیر تہذیبی شعور کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ وہ محض ایک نسوانی کردار نہیں بل کہ اس عہد کی تہذیبی، سماجی اور ذہنی ساخت کی نمائندہ ہے۔ اس کی زندگی میں دربار، حرم، کوچہ، ادب، عشق، سیاست اور سماجی جبر سب ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ وزیر خانم کے ذریعے فاروقی نے یہ واضح کیا ہے کہ عورت محض تہذیب کی تابع نہیں بل کہ تہذیب کی خالق بھی ہے۔ اس کردار کی ذہنی بالیدگی، جمالیاتی ذوق اور سماجی شعور دراصل اس عہد کی تہذیبی پیچیدگیوں کو اجاگر کرتا ہے۔

ناول میں زبان و بیان کا اسلوب بھی کثیر تہذیبی شعور کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ فارسی آمیز اردو، محاورات، ضرب الامثال، کلاسیکی شعری حوالے اور تاریخی اصطلاحات ناول کی تہذیبی فضا کو مستحکم کرتے ہیں۔ زبان یہاں



محض اظہار کا وسیلہ نہیں بل کہ تہذیب کی امین بن کر سامنے آتی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے زبان کے ذریعے اس عہد کے ذوق، آداب، اقدار اور سماجی مراتب کو نہایت فنی مہارت سے پیش کیا ہے، جو اردو ناول میں ایک منفرد تجربہ ہے۔

ناول کا تجربہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ کثیر تہذیبی شعور محض ماضی کی یاد نہیں بل کہ حال اور مستقبل کے لیے ایک فکری رہنمائی بھی فراہم کرتا ہے۔ فاروقی نے تاریخ کو جامد واقعات کے مجموعے کے طور پر نہیں بل کہ ایک زندہ، متحرک اور معنویت سے بھرپور عمل کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس عمل میں تہذیبیں باہم ٹکراتی بھی ہیں اور ایک دوسرے سے سیکھتی بھی ہیں۔ یہی باہمی ربط ناول کو محض تاریخی ناول کے دائرے سے نکال کر ایک فکری اور تہذیبی دستاویز بنا دیتا ہے۔

اس ناول میں زوال پذیر مغلیہ سلطنت، نوآبادیاتی طاقتوں کی آمد اور مقامی تہذیب کے بدلتے ہوئے خدوخال نہایت گہرے شعور کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ یہاں تہذیبی زوال صرف سیاسی شکست کا نام نہیں بل کہ اقدار، روایات اور شناخت کے بحران کی علامت بھی ہے۔ تاہم اس زوال کے باوجود تہذیبی شعور مکمل طور پر معدوم نہیں ہوتا بل کہ نئی صورتوں میں خود کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی نکتہ ناول کو فکری طور پر گہرا اور معنوی طور پر وسیع بناتا ہے۔

”کئی چاند تھے سر آسماں“ کا اختتامیہ اس بات کی توثیق کرتا ہے کہ شمس الرحمن فاروقی نے اردو ناول کو ایک نئی فکری سمت عطا کی ہے۔ انہوں نے کثیر تہذیبی شعور کو محض نظری بحث کے طور پر نہیں بل کہ ایک تخلیقی تجربے کے طور پر پیش کیا ہے، جس میں تاریخ، تہذیب، ادب اور انسانی نفسیات باہم مدغم ہو جاتے ہیں۔ یہ ناول قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہماری موجودہ شناخت بھی دراصل ماضی کی تہذیبی آمیزش کا نتیجہ ہے۔

آخر کار یہ کہا جاسکتا ہے کہ ”کئی چاند تھے سر آسماں“ اردو ادب میں کثیر تہذیبی شعور کی تشکیل کا ایک اہم اور نمائندہ متن ہے۔ اس ناول کے ذریعے شمس الرحمن فاروقی نے یہ ثابت کیا ہے کہ ادب محض تفریح یا داستان نہیں بل کہ تہذیبی شعور کی تشکیل اور فکری آگہی کا موثر ذریعہ بھی ہے۔ یہ ناول ماضی اور حال کے درمیان ایک مضبوط فکری پل قائم کرتا ہے اور قاری کو تہذیب کی ہمہ گیر معنویت سے آشنا کرتا ہے۔ یوں یہ ناول نہ صرف اپنے عہد کی نمائندگی کرتا ہے بل کہ اردو ادب کے فکری سرمائے میں ایک بیش قیمت اضافہ بھی ہے۔



حوالہ جات

- ۱۔ ’المنجید‘، (عربی اردو لغت)، لوئیس معلوف، ترجمہ: مولانا عبدالحفیظ، (لاہور: مکتبہ قدوسیہ، ۲۰۰۹ء)، ص: ۸۷
- ۲۔ ’فرہنگِ آصفیہ‘ مرتبہ: سید احمد دہلوی، مولوی (جلد اول)، (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۰ء)، ص: ۶۴
- ۳۔ ’نور اللغات‘، مرتبہ: نور الحسن نیر، مولوی، (جلد اول) (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء)، ص: ۱۰۱۳
- ۴۔ شمس الرحمن فاروقی، ’کئی چاند تھے سر آسماں‘ (کراچی: شہر زاد، ۲۰۰۶ء)، ص: ۲۳۶ تا ۲۳۷
- ۵۔ شمس الرحمن فاروقی، ’کئی چاند تھے سر آسماں‘، اظہار تشکر، ص: ۸۷
- ۶۔ ذاکر حسین، ’کئی چاند تھے سر آسماں: نوبل انعام کا مستحق ناول‘، مضمون، ’خبر نامہ شب خون‘، الہ آباد، (انڈیا)، شمارہ نمبر ۳، جنوری تا جولائی

۲۰۰۷ء

۷۔ ماہنامہ ’ساحل‘، کراچی: مئی ۲۰۰۶ء

۸۔ ایڈورڈ سعید ’شرق شناسی‘ ترجمہ: محمد عباس، (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء)، ص: ۲۸۵، ۲۸۶

1. Al-Munjid (Arabi-Urdu Lughat), Louis Maalouf, Tarjuma: Maulana Abdul Hafeez, (Lahore: Maktaba Qudusiya, 2009), p. 87
2. Farhang-e-Asfiya, Murattib: Syed Ahmed Dehlvi, Maulvi (Jild Awwal), (Lahore: Urdu Science Board, 2010), p. 64
3. Noor-ul-Lughat, Murattib: Noor-ul-Hassan Neer, Maulvi, (Jild Awwal), (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1989), p. 1013
4. Shams-ur-Rahman Farooqi, “Kai Chand The Sar-e-Asmaan” (Karachi: Sheherzad, 2006), pp. 236–237
5. Shams-ur-Rahman Farooqi, “Kai Chand The Sar-e-Asmaan”, Izhar-e-Tashakur, p. 847
6. Zakir Hussain, “Kai Chand The Sar-e-Asmaan: Nobel Inaam Ka Mustahiq Novel”, Mashmoola, “Khabar Nama Shab Khun”, Allahabad, (India), Shumara No. 3, January to July 2007
7. Monthly “Sahil”, Karachi: May 2006
8. Edward Said, “Sharq Shunasi”, Tarjuma: Muhammad Abbas, (Islamabad: Muqtadra Qaumi Zaban, 2005), pp. 285–286